© rasailojaraid.com



# الوَداع یا سیدی

ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان

یہ لکیریں کچھ یادوں کا تحریری سراپا ہیں۔ ایک ایسا مضمون لکھنے کی کوشش ہے جس کے لیے دل یا دماغ کبھی تیار نہیں ہو سکتے تھے، چنانچہ اِس میں کسی ترتیب یا تسلسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔ یہ تحریر بھائی سید ذوالکفل بخاری سے میرے تعلق کی مصوری ہے۔ لیکن لفظِ تعلق سے یہ التباس نہ ہونا چاہیے کہ یہ سروکار برابری کی سطح کا تھا، یا جس میں کچھ لین اور کچھ دین والی بات تھی۔ یہ سراسر یکجہت تعلق تھا جس میں میں صرف اور صرف لین ہار تھا اور وہ ہر لحظہ دین ہار۔ وہ علم وفضل اور جملہ اوصافِ حمیدہ کے زندہ شعائر میں سے تھے اور یہ نادان مجسم جہلستان۔ خوش قسمت ہیں وہ جنھوں نے اُنھیں دیکھا۔ یہ وضاحت تحصیلِ حاصل ہے، لیکن ضروری معلوم ہوئی ہے کیوں کہ شائع ہوجانے کے بعد تحریر کا اعتبار قاری کی نظر اور سوچ ہے، جو بسا حالات کوتاہی کر جاتی ہیں۔ دنیا سے سبھی کو جانا ہے لیکن میرے بھائی سید ذوالکفل ابھی اور یوں چلے جائیں گے، اِس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے اور ہم پس ماندگان کے لیے صبر کو شفاعت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔ (حافظ صفوان محمد)

یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ میرے ابوجان مجھے پی اے ایف کا سلیکشن ٹیسٹ دِلانے کے لیے بہاول پور سے ملتان لے کر آئے۔ یہاں میں ذوالکفل سے پہلی بار ملا۔

۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۵/نومبر ۲۰۰۹ء کی دوپہر پاکستانی وقت کے مطابق تین بجے ختم ہونے والی ٹیلی فون کال تک جو تقریباً پانچ منٹ کے دورانیے کی تھی اور ذوالکفل کا کیا ہوا آخری ٹیلی فون، اِس بے مقدار و بے مقدور سے ذوالکفل کا تعلق ہر لمحے بڑھتا ہی چلا گیا۔ اِن چوبیس سالوں میں میں پلک جھپکنے کے برابر وقت کے لیے بھی اِس تعلق کو ٹوٹتا نہیں دیکھتا۔ بلکہ میں تو کوئی لمحہ بھی نہیں ڈھونڈ پاتا جس میں ہمیں ایک دوسرے سے محض گرانی ہی محسوس ہوئی ہو۔ مادّیات کے پیمانوں پر بنتے بگڑتے اور اِنھی کے مولوں تُلتے آج کے تعلقات کے دور میں جب کہ مامتا تک ناخالص ہونے لگی ہے، یہ ایک نادر بات ہے۔ میں اِس کا گواہ ہوں۔ اور اِس کا دوسرا گواہ اب صرف اللہ رب العالمین ہے جس کے جوارِ رحمت میں آج میرا بھائی سید ذوالکفل محوِ استراحت ہے، اور میری راہ تاک رہا ہے۔ اور بے شک میں ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ اُس سے قریب تر ہوا جا رہا ہوں۔ اور زمینوں اور آسمانوں میں موجود کوئی بھی رکاوٹ اِس سفر کی سرعت میں کمی نہیں لا سکتی یہاں تک کہ میں اُس سے جا ملوں گا۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

☆......۱......☆

بھائی سید ذوالکفل اور میں ایک دوسرے کو ''شیخ'' کہہ کر بلاتے تھے۔ خط، ای میل اور ایس ایم ایس میں بھی یہی طرزِ تخاطب چلتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ''شیخ'' کا لقب مجھے محسن شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا تھا اور یہ اُن کے بطورِ تفنن دیے ہوئے خطاب ''حضرت شیخ الاسلام'' کی تخفیف ہے؛ میں نے ذوالکفل کو کب سے اِس لقب سے بلانا شروع کیا، یہ پوری طرح یاد نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تب کی بات ہو جب ذوالکفل نے حضرت خواجہ خان محمد صاحب مدظلہٗ العالی کی بیعت کی تھی۔ اِس



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بیعت کے کچھ دنوں کے بعد میں ملتان سے بہاول پور گیا تو کسی بات پر ابوجان نے مجھ سے کہا کہ اب ذوالکفل صرف ذوالکفل نہیں ہے بلکہ حضرت خواجہ خان محمد صاحب کا مرید ہے۔ یہ اطلاع تو مجھے بھی تھی کیوں کہ جس شام ذوالکفل کو یہ نسبت عطا ہوئی میں بھی دارِ بنی ہاشم میں تھا۔ مجھ سادہ آدمی کو اِس بات کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر ابوجان نے مجھے بتایا کہ جب تم پیدا ہوئے تو حضرت خواجہ صاحب نے تمھارے کان میں اذان دی تھی۔ میرا ذوالکفل کو ''شیخ'' کہنا شاید ابوجان کے اِسی توجہ دِلانے کے سبب سے ہوا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ بھائی سید ذوالکفل ایک بار مجھے خانقاہِ سراجیہ لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے دعا اور توجہ سے کام لیا اور مجھ نہایت بے پیرے قسم کے بندے کو سلامتیِ قلب و نظر کی منزل پر لے آئے۔ جب ہم پہلی بار کندیاں شریف گئے تو بھائی صاحبزادہ محمد حامد سراج صاحب ہمیں اپنی گاڑی میں میانوالی سے لے کر آئے تھے۔ خوب مہمان نوازی کی۔ ہم نمازِ مغرب کے لیے مسجد میں پہنچے۔ حضرت خواجہ صاحب کے پیچھے نمازِ مغرب ادا کی۔ میں نے دیکھا کہ سنتیں اور نفل پڑھنے کے بعد سب نمازی ایک بڑا سا حلقہ بنا کر بیٹھ گئے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے ایک تھیلی سے بڑے بڑے دانے لوگوں کی طرف پھینکے۔ پھر کچھ ذکر کرایا۔ مجھے اُن کی آواز واضح سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں بھائی ذوالکفل کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اُن سے ہلکی سی آواز میں پوچھا کہ میں کیا کروں۔ فرمایا کہ درود شریف پڑھ لیں۔ میں ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، اور بیچ بیچ میں درود شریف بھی پڑھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اُنھوں نے آنکھیں موند لی ہیں۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں نے بھی اُن کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا سی دیر میں میری کیفیت کچھ ایسی ہوگئی کہ میں جیسے زمین کی کششِ ثقل سے آزاد ہوگیا ہوں۔ اب میں ہوں یا خدا کی ذات ہے۔ کچھ چیزیں مجھے اپنے اوپر اُترتی محسوس ہوئیں۔ میرا دل شدید دھڑکن کے بعد آہستہ آہستہ ٹھنڈا اور پھر ایک دم پُرسکون ہوگیا۔ یوں لگا جیسے حدِ نگاہ تک ہر طرف ایک سفید سمندر ہے۔ پھر یہ سمندر مجھے آہستہ آہستہ لہریں بنتا محسوس ہوا۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم لپکوں نے مجھے جیسے اُٹھالیا اور ہولے ہولے پینگنا شروع کردیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں کتنی دیر تک زمان و مکان کی قیود سے نکلا رہا۔ مجھے ماحول کی کوئی آہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ پھر جب میں نے خود کو زمین سے لگا محسوس کیا تو آنکھیں کھولیں۔ میں نے اُن کو اُسی کیفیت میں پایا جس میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں اُنھوں نے بھی آنکھیں کھولیں۔ میں نے اپنے اندر جھانکا تو دیکھا کہ اہلِ ذکر اور پیری مریدی کی بابت جو ہٹ دھرمی اور کلونس سی میرے قلب و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، یا بلکہ جس میں قلب و دماغ چُنے ہوئے تھے، یوں فضا میں تحلیل ہوگئی ہے جیسے گیلے کپڑے کو دھوپ میں پھیلائیں تو اُس سے پانی اُڑ جاتا ہے۔ دعا ہوئی۔ ہم جلدی سے اُٹھ کر لوگوں کے پیچھے جا کر سیڑھیاں اُترے اور اُس کمرے تک گئے جہاں سے خواجہ صاحب اندر تشریف لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب ہمیں گھر میں لے گئے۔ کھانا لگ چکا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے مسجد میں آکر عشاء پڑھی۔ گھر واپس ہوئے تو صحن میں بچھی چارپائیوں پر پڑ رہے۔ مجھے اُنھوں نے صرف ایک جملہ کہا: ''ایتھوں جو کجھ لے سکدے او لے لئو۔ ایتھوں بعد انھیر اای انھیر ااے، ہر پاسے۔'' صبح نماز کے بعد پھر ذکر ہوا۔ مجھے خواجہ صاحب ایک ایسے آدمی لگے جنھوں نے اپنی پوری زندگی لوگوں کی حالت سُدھارنے میں لگادی تھی۔ مجھے اُن پر بہت رشک آیا۔ میں خوش تھا کہ آج میں نے آنکھوں سے ایک ایسا آدمی دیکھ لیا ہے جن کے ہاتھوں پر ہزاروں لاکھوں لوگوں کے اسلام لانے کی باتیں تاریخ میں لکھی ہوئی ہیں۔ خواجہ صاحب تشریف لائے۔ ذوالکفل نے میرا تعارف کرایا اور اپنے نانا حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ اور میرے دادا جان، اور میرے ابوجان کا ذکر کیا۔ خواجہ صاحب نے سر ہلایا اور پلکیں جھپکائے بغیر مجھے یوں دیکھتے رہے کہ میں سر سے پاؤں تک گویا دُھل گیا، بلکہ، درست تر الفاظ میں، اُن کے اِس دیکھنے نے مجھے ریل پیل کر رکھ دیا۔ پھر بھائی ذوالکفل نے مجھ سے چپکے سے پوچھا کہ بیعت کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ اگر آپ کہیں تو۔ اب اُنھوں نے حضرت سے درخواست کی کہ حافظ صاحب کو بیعت فرمالیں۔ حضرت باباجی مدظلہ نے مجھے بیعت فرمالیا۔ اور بہت دیر تک دعا فرماتے رہے۔ مجلس برخواست



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہوئی۔ ذوالکفل جب آخری بار خانقاہ گئے ہیں تو اُنھوں نے حضرت باباجی مدظلہٗ کو جامعۂ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں ملازمت کی اطلاع دی۔ خصوصی دعا کی درخواست کی تو حضرت نے سرائیکی لہجے میں فرمایا کہ دعا تو تم کرو، تم وہاں پہنچ گئے ہو۔

یہ بجا کہ میرے کان میں اذان حضرت خواجہ صاحب مدظلہٗ نے دی ہے۔ لیکن مجھ ناٹھور کا تعلق خانقاہ سے کرانے کی نیکی، جس سے میری اور میرے خاندان کی سمت متعین ہوئی، صرف میرے ''شیخ'' سید ذوالکفل بخاری کے مقدر میں لکھی تھی۔ وہ میرے شیخ بھی ہیں، شیخ گر بھی۔ اللہ اُن کو اِس کارِ خیر کی بہترین جزا دے۔

☆......۲......☆

ادب کے موضوع پر فرماتے تھے کہ مجھے ادب کو کیریئر نہیں بنانا ہے خواہ کچھ ہی ہوجائے۔ یہ کارِلا حاصل ہے۔ اگر کتاب سازی ہی کی بات ہے تو میں بڑا بول نہیں بولتا، اِن شاء اللہ دو تین نشستوں ہی میں ایک مجموعہ مرتّب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام ہم نے کرنا ہی نہیں۔ اِس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ تو جائز کریڈٹ لینے کے وقت میں بھی کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اور اگر کوئی اُن کے سامنے اُن کی تعریف کرنے پر تُل ہی گیا ہے تو سراپا انکسار بن کر بات کو دوسری طرف لے جاتے، یا ہنسی میں اُڑا دیتے۔

ایک ایسی بات جس میں وہ نایاب ترین لوگوں میں سے تھے، یہ ہے کہ وہ ہمیشہ انتہائی اخلاص سے مشورہ دیتے تھے۔ ایک بار ہم دونوں دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد میں عبدالجبار شاکر صاحب کے ہاں گئے تو وہاں ذوق اور عمر کے اعتبار سے بچوں کی کتابیں اور کچھ اور چیزیں چھاپنے کا پورا خاکہ، مع کاروباری ضرورتوں کے، اور عرب دنیا میں بھی جہاں جہاں اردو کا چلن ہے وہاں وہاں تک اِس کی اشاعت کے امکانات کے، بیان کردیا۔ عربی میں تازہ چھپی اِن موضوعات کی کچھ کتابوں کا بتایا۔ انگریزی کی بھی دو ایک تازہ کتابوں کے تراجم کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ اُن کو کچھ کتابوں کے نام بھی لکھوائے۔ الغرض وہ جہاں بیٹھتے، وہاں کے اہلِ مجلس کی ضرورتوں کے حسبِ حال کاموں کا پورا خاکہ کھینچ دیتے تھے۔

اِسی طرح جامعہ خیرالمدارس ملتان کا ایک رسالہ نکلا (یا اُس کی اِدارت مولانا ازہر صاحب کے پاس آئی، صحیح یاد نہیں) تو بھائی ذوالکفل مجھے لے کر ایک دوپہر شدید گرمی میں اُن کے پاس گئے۔ مجھے راستے میں بتاتے رہے کہ اِس رسالے کی پہنچ کیسی اور کہاں تک ہے اور یہ کتنا اہم ہے۔ وہاں پہنچے تو مولانا سے تفصیلی بات چیت کی۔ پوری ترتیب بتاتے رہے۔ میں دیکھتا رہا کہ وہ خود ایک رسالہ (نقیبِ ختمِ نبوت) نکالتے ہیں، اور پھر بھی کس دلسوزی سے اپنے تجربات اُن کے گوش گزار کررہے ہیں۔ بالکل اِسی طرح صاحبزادہ محمد حامد سراج صاحب نے میّا لکھی جو اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی و فارسی (جتنی کہ ہم نے پڑھی ہے اُس سب) میں بھی اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے؛ ہم حاضر ہوئے تو اِس پر بات چیت کے ساتھ ساتھ اُن کے آئندہ عزائم سے آگاہی ہوئی۔ شیخ نے اُن کے ساتھ افسانوں کے خیالات اور اُن کی پیشکش کے بارے میں کئی نشستوں میں سیر حاصل بحث کی، اور یہ بتاتے رہے کہ خاص کر ہم (اہلِ نسبت) لوگوں کو کن موضوعات پر لکھنا چاہیے۔ صاحبزادہ صاحب ہماری مشایعت کے لیے اڈے تک تشریف لائے تو ہمارے کوچ میں سوار ہوتے تک اُن سے اِنھی موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ شیخ کے پاس بیٹھنے والے لوگ محض اَخفش کے ''دلیلے'' نہیں ہوتے تھے (یا نہیں رہتے تھے) بلکہ اُن کی قوتِ انجذاب میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوجاتا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں لوگوں کو منہمک (Absorb) نہیں بلکہ شامل (Involve) کیے ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو بھی اُن سے کہیں ایک مرتبہ بھی مل لیا ہے، آج تک اُنھیں نہیں بھولا۔ آج یہ بتانے والے بہت سے لوگ ہیں کہ اُن میں کا ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ بھائی ذوالکفل کا تعلق اُسی کے ساتھ سب سے زیادہ تھا۔ آپ کو ایسے کئی لوگ ملیں گے جن سے اُن کی صرف ایک ملاقات ہے اور وہ بھی سالہا پہلے، لیکن اب اُن کو بڑی محبت سے یاد کررہے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں ایک حدیثِ پاک میں اِس مفہوم کا مضمون آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بذاتِ خود ساری مخلوق میں اعلان فرماتے ہیں کہ مجھے آدم کے فلاں بیٹے سے محبت ہے، تم سب بھی اُس سے محبت کرو۔

میرے شیخ میں مشفق خواجہ صاحب والی کئی ایک باتوں کی جھلک ملتی ہے: خود کم لکھا، دوسروں کو لکھنے پڑھنے سے زیادہ لگایا؛ لکھنے پڑھنے والوں کی مدد گیری اور خبر گیری؛ مذہبی اور علمی حلقوں میں یکساں مقبولیت؛ دین داری اور شعائرِ دین کا تحفظ؛ مذہب فروشوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے سے نفور؛ کسی سے بھی دوبدو نہ ہونا؛ قلم کی حرمت کا خیال رکھنا اور قلم کا پھوہڑ پن بالکل نہ ہونا؛ ادب میں مقصدیت؛ وغیرہ وغیرہ۔ میرے شیخ بہت جلدی میں تھے۔ بہت سے کام تھے کرنے کو۔ بہت سرعت کے ساتھ سب کچھ کرتے چلے گئے۔ میں گواہ ہوں کہ وہ جہاں جاتے، کچھ کر کے اُٹھتے، یا کچھ لوگوں کو کسی ہدف پر متعین کر دیتے۔ پھر اِن میں سے بلاتخصیص ایک ایک کو پوچھتے بھی رہتے۔

☆

میری سعادت ہے کہ میں سفر و حضر میں لمبی مدت تک اُن کے ساتھ رہا ہوں، اور سالہا سے اُن کے ساتھ معاملت بھی رہی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے اخلاق مجھے جس آدمی میں سب سے زیادہ نظر آئے وہ سید ذوالکفل ہیں۔ یہ یکے از دوستاں (Company) کی گواہی ہے، جسے تسلیم کیا جانا چاہیے۔

میرے شیخ کے اندر لوگوں کو جمع کرنے اور جمع کیے رکھنے کی ایک نادر صلاحیت جاگزیں تھی—صلحِ کُل کی ایک عجیب کیفیت۔ اُن کے پاس ایسے مختلف الخیال لوگ آ کر جمع ہو جاتے تھے جو آپس کے تعلقات کی وجہ سے شاید کبھی نہ مل سکتے۔ وہ ہر ایک سے خیر سگالی کرتے، بدسگالی اُن کے خمیر ہی میں نہیں تھی۔ میں نے اُنھیں کسی کو غلط مشورہ دیتے یا ٹرخالوجی لگاتے تو کیا، کسی کو لمبا راستہ تک بتاتے نہیں دیکھا۔ اُن کا مشورہ اور باتیں اخلاص میں گویا لتھڑی ہوئی ہوتی تھیں۔

اُن کا ظرف بہت وسیع تھا۔ سلامِ روستائی کے لیے آنے والے اور ایسے بہت سے اہلِ غرض جو اُن کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، اُن کی تیز نگاہوں سے چھپے ہوئے نہ تھے اور نہ ہی اُن کے عزائم و مقاصد سے وہ ناآشنا تھے۔ لیکن اپنی خلقی نجابت، وسعتِ نظری اور خوش اندیشی کی وجہ سے وہ سب کو ساتھ لیے ہوتے تھے۔ اُن کا مزاج دینے کا تھا، لینے کا نہیں۔ خود پیچھے رہنا اور لوگوں کو سامنے لانا بھی اُن کی صفت تھی۔ کسی میں ذرا سا بھی کرنٹ دیکھتے، اُسے اِدھر اُدھر متعارف کراتے۔ اور صرف متعارف ہی نہ کراتے بلکہ جوڑ بھی بٹھا دیتے (Physical patching)۔ کتنے ہی لوگ ہیں جن کے قدوں میں شیخ کی علمی قامت کی اونچائی شامل ہے۔

مربی یعنی تربیت کرنے والے کا کردار اور راہ نمائی (Direction) بھی شیخ کے مجموعی کردار کی ایک دمکتی اکیت ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اُن کا مسلسل ''نگرانی'' میں رکھنا اور ایک طرح سے انگلی پکڑ کے چلائے چلے جانا میرے علم میں ہے، یہاں تک کہ یہ لوگ مختلف شعبوں میں پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہو گئے۔ اُنھوں نے جس کا ہاتھ پکڑا اُسے توڑ تک پہنچایا۔ اللہ کرے کہ جنھیں ڈائریکشن دی گئی تھی وہ منزل کھوٹی نہ کریں۔ درخت کا حال پھلوں ہی سے تو معلوم ہوتا ہے۔

میز بانی بھی ختم تھی میرے شیخ پر۔ وہ مشہور مقولے **مَنْ زَارَ شَيْخًا وَلَمْ يَذُقْ عِنْدَهٗ شَيْئًا فَكَاَنَّمَا زَارَ شَيْخًا مَيِّتًا** میں ''شیخ'' کی عملی تصویر تھے۔ بہت ہی کم ایسا ہوا ہے کہ کچھ دوستوں نے اکٹھے ہو کر کھانے کا پروگرام بنایا ہو اور اِس میز بانی کا سارا اجر بھائی ذوالکفل خود نہ لے گئے ہوں۔ خالد صاحب، شیخ اور اِس خاکسار کی ٹرائیکا (Troika) کی آخری میز بانی بھی شیخ نے کی تھی اپنی بیٹھک میں۔

اُن میں ہر وقت لوگوں کے کاموں میں لگا رہنے کی نایاب صفت بھی تھی؛ ہر ایک کا کام کرنے کے لیے ہر دم تیار۔ اُسی وقت کوئی ترتیب بنانے کی کوشش میں لگ جانا، یہ بھی اُن کا ایک خاص وصف تھا۔ بلکہ دوسروں کے کاموں میں وہ ہمیشہ زیادہ چوکسی دکھاتے اور ذاتی کاموں میں عموماً ڈھل مَٹھ۔ ایک مثال یاد آ رہی ہے کہ بالکل تازہ ہے: میرے ایک عزیز دوست ڈاکٹر ظہیر احمد



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



(سَرے یونیورسٹی، برطانیہ) کو سعودیہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ وہ تھوڑا ہی عرصہ وہاں رہے لیکن اُن کے اہلِ خانہ سمیت رہائش کا بندوبست، اور دیگر، سب میرے شیخ نے بڑی تندہی سے کیا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں ہیں کہ دیارِ غیر میں جا کر سگے سمبندھی تک کام نہیں آتے، اور ایک میرے شیخ ہیں کہ اُن لوگوں کے کاموں میں بھی لگے ہوئے ہیں جن کے وہ صرف نام آشنا تھے اور کبھی سلام علیکی تک نہ تھی۔ وہ خود تو دوسروں کے کام آتے رہے اور جن سے جیتے جی کا ناتا تھا اُن کے بوجھ اُٹھاتے رہے، لیکن غیور اِتنے تھے کہ اِس کی بہا میں کسی سے کوئی کام نہ لیا۔ حتیٰ کہ ہم میں کے کسی کو کندھا تک نہ دینے دیا۔

دوستوں میں تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہی ہے۔ شیخ اِس بارے میں باذوق بھی تھے اور متحرک بھی۔ شاید ہی کبھی تحفہ دینا بھولے ہوں۔ جہاں تعلق بنا، اُس کے مناسبِ حال تحفہ ضرور دیتے تھے۔ ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اُن کے سعودیہ کے ایک رفیقِ کار محمد سلیم صاحب ہیں جو مانسہرہ میں رہتے ہیں۔ یہ دونوں لوگ چھٹیوں میں تقریباً اکٹھے ہی پاکستان آتے۔ اور جب آنا ہوتا تو شیخ ہمیشہ اُن کے لیے ملتان سے آم بھجواتے۔ مجھے اِس کا ناغہ یاد نہیں۔

میرے شیخ سید ذوالکفل ایسے زندہ دل، بشاش اور خوش مزاج تھے کہ باید و شاید۔ ہر عمر اور ذوق کے لوگوں میں یکساں مقبول۔ لطیفوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ کسی بھی قوم یا زبان والوں کے خلاف ایس ایم ایس نہیں کرنے چاہییں۔ منافرت پھیلتی ہے۔ اللہ کے نزدیک تو سب قومیں برابر ہیں اور اعتبار صرف تقویٰ کا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ اُن کے سے انداز میں ''چہار رواٹیٹ مُچپڑ''، ''پاپوش کاری''، ''ضربیات کی نشانیات''، ''ظفر المُلکتّہ والدین'' اور ''وعلیکم السلام مع الکشمش والبادام'' وغیرہ وغیرہ، اب ہوا ہوئے۔ ایک اور بات یاد آئی: میں نے ۲۰۰۲ء میں حج سے واپسی پر اُنھیں حجازِ اقدس میں No Smoking کے اشتہارات کے ساتھ لکھی عبارت سنائی جس کی آخری سطر تھی: **وَالدُّخانُ خَبیث** (دھواں برا ہے)۔ اِسے اگر اِعراب کے بغیر پڑھا جائے (جیسا کہ وہاں سائن بورڈوں پر لکھا ہوتا تھا) تو یہ بنتا تھا: والد خان خبیث۔

تحفیظ مراتب کی بھی اُن کے ہاں خاص طور سے رعایت ملتی ہے۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ملاحظہ خاندانی لوگوں کی روایت اور وجہِ امتیاز ہے۔ لیکن دوسری اور تیسری پیڑھی تک کے لوگوں کی اِس وجہ سے قدر کرنا کہ مثلاً فلاں کے دادا ہمارے نانا کے ساتھ رہے، اِس لیے اُس سے ملنا اور توجہ کرنا، یہ رویہ کم سے کم میری عمر کے لوگوں میں نہیں ملتا۔ یہ شیخ کی ایک خاص ادا تھی جواب نہیں ملتی۔ کتابوں کے علاوہ شاید کہیں بھی نہیں۔ میرا اپنے ابو جان کے دوستوں سے تعلق رکھنا میرے شیخ کو خاص طور سے بہت پسند تھا۔

میرا دل بڑھانے کو کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ ہم بنو ہاشم حجازی سید ہیں، آپ راجپوت ہندوستانی سید ہیں۔ اِس پر بڑی باتیں چلتی تھیں۔ خصوصاً پاک و ہند کی بہت سی قوموں کے امتیازی وصف اُنھیں ازبر تھے جن سے اہلِ محفل بے حد محظوظ ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات تو حیرت کی وہ کیفیت ہو جاتی تھی (جس کے لیے میرے پاس اردو کا کوئی مناسبِ حال محاورہ الاٰن موجود نہیں ہے) جسے ہم سرائیکی میں وات پٹنا کہتے ہیں اور جسے ظریفؔ لکھنوی نے پوربی لہجے میں یوں بیان کیا ہے:

جَون بِریا پڑھوس بانکی کجل جھلاّئے کے
کوءُ جھومن لاگ، کوءُ رہ گئو منہ بائے کے

شیخ کے بارے میں ایک چلتی صحافتی اصطلاح استعمال کی جائے کہ وہ احرار کے تھنک ٹینک تھے تو یہ اُن کو محدود کر دینا بھی ہوگا، کیوں کہ اُن کی بیدار مغزی سے تنہا مجلسِ احرار ہی مستفید نہ ہوتی تھی۔ اردو میں تازہ وارد اِس اِصطلاح کا مطلب مفکرین یا دائرۂ دانش ہونا چاہیے، وہ تھنک ٹینک میکر یا اردو میں کہیں تو مفکرین ساز یا صورت گرِ دائرۂ دانش تھے۔ اُن کی مذہبی و سیاسی بصیرت داری کی بساطت ہم عمروں ہی نہیں بلکہ بعض بڑے دماغوں سے بھی آگے نکلی ہوئی تھی۔

میں نے کچھ ہی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایک بات کسی کے حوالے سے دوہرائیں، یا کسی کا قول دوہرائیں، تو چاہے یہ دوہرانا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



سالوں کے بعد ہو، لفظ بہ لفظ ہوتا ہے۔ یہی نادر بات میرے شیخ میں بھی تھی۔ یہ اُن کی خاص الخاص اور ممتاز باتوں میں سے ہے۔

میرے شیخ کے آنے پر محفل کا رنگ بالکل بدل جاتا تھا۔ لوگ لایعنی میں لگے ہوئے ہیں جیسے مثلاً تھڑے پر بیٹھے ہوئے لوگ صدام حسین کو مشورے دے رہے ہیں، تو بڑے طریقے سے ایک آدھ جملے میں سب کو ٹھیل ٹھال کر کسی کام کے موضوع پر لے آتے۔ اُن کے آنے پر محفل وہ نہیں رہتی تھی جو پہلے ہوتی تھی۔ اُن کے جانے پر بھی محفل کا رنگ بدل گیا ہے۔ جتنے لوگ اُن سے متعلق تھے، سبھی کی محفلوں کا رنگ بدل گیا ہے۔ میں نے اُن لوگوں کو بھی سنجیدہ ہوتے اور آخرت کی باتیں کرتے دیکھا ہے جو اب سے پہلے زندگی کے مقصد کے بارے میں سنجیدہ نہ تھے۔ اُن کے آنے سے تبدیلی آتی تھی، وہ جاتے ہوئے بھی تبدیلی کر گئے ہیں۔

وہ بے حد راحت رساں آدمی تھے۔ ہر ایک کو راحت ہی پہنچانا اُن کی عادتِ ثانیہ تھی۔ مر کے بھی اُنھوں نے راحت ہی پہنچائی۔ اپنی خو نہ بدلی اُنھوں نے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ جب بھی کہیں، کبھی، اُن کا تذکرہ ہوگا، ہمیشہ مکۂ مکرمہ کے تذکرے پر ختم ہوگا۔ جب بھی اُن کو یاد کریں گے تو مکہ یاد آئے گا۔ خانۂ کعبہ کا ذکر ہوگا۔ وہ جگہ یاد آئے گی جہاں رہنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسرت کیا کرتے تھے، کہ میں تو رہنا چاہتا تھا تیرے مکینوں نے نہ رہنے دیا۔ وہ اُس جگہ کے ساتھ لازم وملزوم ہوگئے۔ وہ مر کے بھی ہم پس ماندگان کو راحت پہنچا گئے، اور اللہ اور اُس کے گھر کی مستقل یاد کا سامان فرما گئے۔ یہ ہم جیسے عاشقان کے لیے ہے کہ ہم شدِّ رحال میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

☆

''ثقافت'' کے لفظ کو شیخ خاص طور سے استعمال کرتے تھے۔ اور اِس کی کئی باریکیوں کے اِس خاکسار کو آگاہ بھی فرمایا۔ فرماتے تھے کہ یہ ایک نہایت ''مشکل کشا'' لفظ ہے۔ بس جہاں ''پھنساوٹ محسوس'' ہو، اللہ کا نام لیں اور اِس لفظ سے بات یا جملہ شروع کردیں، آگے چل سوچل ہے۔ شیخ فرماتے تھے کہ اصرار اُن چیزوں پر کرنا چاہیے جن کے حرام یا حلال ہونے کے بارے میں قطعی حکم ہے۔ جو چیزیں ہمارے معاشرے کی پیداوار ہیں اور جن چیزوں کی بابت ثقافت یعنی علاقائی رواج و روزمرہ پر بات چھوڑ دی گئی ہے اُن میں شدت نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک چیز ہمارے ہاں اِس لیے اچھی ہے کہ یہاں کی ثقافت سے میل کھاتی ہے، اُسے کہیں اور برا کہنا، یا یہیں پر کچھ لوگوں کا اُس پر ناک بھوں چڑھانا درست نہیں، جیسے پان کھانا یا سگریٹ یا حقہ پینا، دھوتی پہننا، یا مثلاً کسی علاقے میں کالر والی یا گول گھیرے والی قمیص پہننا، یا لڑکیوں کا فراک وغیرہ پہننا۔ اِن چیزوں کو حرام یا حلال کی فہرست میں نہیں لگانا چاہیے۔

☆

شیخ ہمیشہ اصرار کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ سب پڑھے لکھے لوگ سیرتِ پاک کو درسًا مطالعے میں رکھیں۔ مجھے خاص طور سے فرمایا کہ اِس بات کو تحریک کے طور پر چلاؤں۔ اور سیرتِ مطہرہ کی کچھ کتابیں تجویز کیں: سیرتِ مصطفٰیؐ، الرحیق المختوم اور سیرتِ احمدِ مجتبٰیؐ۔ الحمدللہ بیسیوں دوستوں نے اِس ترغیب پر سیرت کی یہ کتابیں لیں اور شیخ کے حسب الحکم اُن کے دفاتر میں میز پر رکھی ہوتی ہیں۔

☆

اللہ نے میرے شیخ کو جو آخری آرام گاہ دی ہے اُس نے بہت سے سوالات کا جواب ازخود دے دیا ہے۔ اللہ کی یہ مشیت اُن کی سعدیت اور تقویٰ طہارت کی خوبیوں پر صاد کرنے سے زیادہ اُن کے مسلک ومشرب کی راستی پر مہر کرگئی ہے۔ دین میں ملاوٹوں، اور کاٹھ کباڑ اور جھوٹ کے انبار کو دین کے نام پر پیش کرنے والوں کے خلاف خالصتاً غیرتِ دینی کی بنیاد پر اُن کے نانا رحمۃ اللہ علیہ نے جو کام شروع کیا تھا، اور جس میں اُن کے ماموؤں نے مزید رنگ بھرے اور تحریک کے خطوط واخوال میں طرحیں ڈالی تھیں، اور جس سب کو بحیثیت عقیدہ میرے شیخ نے زندگی کی آخری سانس تک اپنے پیشِ نظر رکھا تھا اور جسے وہ اپنا بہترین توشہ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



خیال کرتے تھے، اللہ نے اُن کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والی ہستی کے جوار میں جگہ دے کر اِس مسلک ومشرب کے سُچے پن کی بھی تصدیق کردی ہے۔ اُن کا خمیر بنی ہاشم کا تھا، اللہ نے بر اعظموں کی دوری سے اُن کی خاک کو اُٹھا کر بنی ہاشم کی جدّۂ اعلیٰ کی پائینتی میں جا پہنچایا ہے۔ اللہ نے اُن کو زمین کا وہ ٹکڑا عطا کیا ہے کہ جس سے بہتر تصور میں نہیں آتا۔

☆......۳......☆

شیخ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی باریکیوں کی طرف کئی بار میری توجہ دِلائی۔ مثلاً یہ کہ گھر والی اور اپنے بچوں کے حقوق کیا ہیں۔ والدین اور بہن بھائیوں، ساس سسر اور سسرال والوں کے حقوق کیا ہیں۔ دفتر والوں اور اہلِ محلّہ کے کیا حقوق ہیں۔ اِن حقوق کے بارے میں وہ تفصیلی بریفنگ دیا کرتے تھے۔ اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ کئی اور دوستوں کو بھی۔ فرماتے تھے کہ یہ سب اہلِ حقوق ہیں اور اِن سب کے حقوق کا اپنا اپنا دائرہ اور سرحد ہے۔ یہ سیکھنے کی چیز ہے کہ ہر ایک کے حقوق اِس طرح ادا کیے جائیں کہ اِفراط تفریط نہ ہو۔ اِسی عدم توازن کا نتیجہ کشاکش کی صورت میں نکلتا ہے۔ کئی بار فرمایا کہ جب بھی سفر سے واپس ہوں کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے جایا کریں۔ بیگم کو اگر دوست بنالیں تو یہ بڑی کامیابی ہے، جس سے آدمی کی کارکردگی میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں وقت ضائع کرنے کا بادشاہ ہوں اور لا اُبالی پن بھی مجھے وافر ودیعت ہوا ہے، اور میری زندگی کا بڑا حصہ تو صرف یسّو پنجو کھیلنے جیسی مصروفیات سے عبارت رہا ہے۔ شیخ نے میرے لیے نظام الاوقات اور لکھنے پڑھنے، بچوں کی تربیت، لوگوں سے میل ملاقات، وغیرہ، کئی باتوں کی پوچھ پرتیت اپنے اوپر گویا لازم کی ہوئی تھی۔

میرے گھر میں بے شمار کتابیں دیکھ کر شیخ نے فرمایا کہ وہ اللہ کی بندی جو آپ کے گھر میں اِن کتابوں کا بکھیڑا سنبھالتی ہے، اُس کا کوئی روزینہ ہی مقرر کردیں۔ میں نے فوراً دس روپے یومیّہ مقرر کردیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میری تنخواہ ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔ بیگم کو اِس مد میں دیا جانے والا محنتانہ جو پہلے یومی اعتبار سے چل رہا تھا، اب ایک ہزار روپے ماہوار چل رہا ہے۔

بچوں کی تربیت کے بارے میں شیخ نے بتایا کہ کامیاب زندگی کے لیے بنیاد کا ایک پتھر یہ ہے کہ ماں اور باپ کو مشورے سے آپس میں گرم اور سرد تار کی طرح بن جانا چاہیے، یعنی ماں اور باپ میں کا ایک سخت گیر ہونا چاہیے کہ بچے اُس کے ڈر کے دائرے سے باہر نہ نکلیں، جب کہ دوسرے کو صرف دوستانہ رکھنا چاہیے کہ بچے اُسے اپنی جائے پناہ محسوس کریں اور ہر طرح کی باتیں اُس سے کرسکیں۔ فرماتے تھے بہتر ہے کہ سرد تار باپ بنے اور گرم تار ماں، کیوں کہ بچوں کو زیادہ وقت ماں کے سر پر رہنا ہوتا ہے۔ اِس سے بچوں کا نماز روزہ، پڑھائی، دوستیاں، تمیز داری، کھیل کود وغیرہ سبھی کچھ قابو میں آجاتا ہے۔ اگر ماں سخت گیر ہو تو سٹکے لگائے بغیر بھی بچے خود بخود سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ماں کا داب دپٹ قائم رہنا چاہیے۔

فرمایا کہ لوگ بچوں سے دعا کیوں کراتے ہیں۔ شاید اِس لیے کہ وہ معصوم اتنے اُلجھے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور بوڑھے مسلمان سے بھی اللہ شاید اِس لیے حیا کرے گا کہ وہ بے چارہ دنیا گزار کے اِتنا پریشان ہو چکا ہوتا ہے کہ سب کچھ لٹا چکنے کے بعد اور مہلتِ عمل کے بھی جاتے رہنے کے بعد وہ بھوندلا گیا ہوتا ہے، اور اِسی کیفیت کی وجہ سے اب کچھ نہیں مانگ سکتا سوائے رحم والا معاملہ کیے جانے کی امید کے۔

زندگی میں کم لوگ ملتے ہیں کہ اُن کے اتباع کی خواہش کی جائے۔ دوستوں میں تو ایسا شاید ممکن ہی نہیں ہوتا کہ اُس کی ''راہ'' کو اپنایا جائے۔ مثالی کردار (RoleModel) دوستوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ میں بڑی خواہش کرکے، اُس طرح کرنے کی کوشش کرتا تھا جیسے شیخ کو کرتا دیکھتا۔ میں کبھی کبھی رشک کی بہت عجیب کیفیت کے ساتھ دعا کیا کرتا تھا کہ اللہ مجھے ذوالکفل جیسا بنادے۔ اور اب سب سے بڑی دعا ہی یہی ہے اللہ مجھے اُن جیسی موت اور آخری آرام گاہ دے دے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ میں گھر میں آنے والی موت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، اور یہ دعا مانگتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں گھر سے جتنا دور سے دور جانا میرا مقدر ہے جب میں وہاں پہنچ جاؤں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



تو اللہ اپنے پاس بلالے۔ شیخ نے کہا کہ اللہ سے یہ دعا بھی ساتھ مانگ لیا کریں کہ اے اللہ مجھے اُس وقت اپنے پاس بلانا جب میں تیری معرفت اور تیری ملاقات کے شوق کی اُس سطح پر ہوں جتنی زیادہ سے زیادہ میرے مقدر میں ہے۔ بے شک میرے شیخ کی ذات میں یہ دونوں ہی باتیں جمع ہوگئی ہیں: گھر سے دور سے دور موت، اور معرفت و ملاقات کے شوق کی انتہا۔ بلکہ اس پر کچھ مزید بھی۔

میری طبیعت بہت خراب ہوئی (۲۰۰۲ء)۔ شیخ اُن دنوں میری عیادت کے لیے ہری پور تشریف لائے جب میں اپنے اردگرد موت کے سائے منڈلاتے دیکھ رہا تھا۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج شام تک، یا بس ایک رات دن باقی رہ گیا ہے۔ اُنھوں نے مجھ سے توبہ کرائی۔ لینا دینا پورا کرایا اور اس کی ترتیبیں سجھائیں۔ میں دے دلا کر ہلکا ہوگیا۔ پھر اللہ کا کرنا کہ میری طبیعت بحالی کی طرف چل پڑی جس کا کہ کسی بھی ڈاکٹر کو یقین نہیں تھا، اور نہ اُن لوگوں کو جنھوں نے میرا وہ حال دیکھا ہے۔ آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ شیخ جا چکے ہیں اور میں ابھی باقی ہوں تو بڑی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔

میں جو بھی لکھتا، اُنھیں دِکھا لیا کرتا تھا۔ میری شاید ہی کوئی تحریر ہو جو اُنھوں نے نہ دیکھی ہوئی ہے۔ بیسیوں منٹ کی کال کر کے وہ بڑی محبت سے اپنی رائے دیتے اور جہاں محسوس کرتے، درستی کرا دیا کرتے تھے۔ میری بہت سی تحریروں میں اُنھوں نے خود بھی کچھ لکھ کر ساتھ لکھوایا۔

☆

لکھنے کی بابت فرمایا کرتے تھے کہ کبھی فوری طور پر یا اشتعال میں آ کر نہ لکھنا چاہیے۔ یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر موضوع پر لکھنا چاہیے، لیکن ہر ایک کو نہیں۔ یہ سوچ لیجیے کہ کس کو کس موضوع پر لکھنے کو کہا جائے، لیکن ہر موضوع پر خود سے لکھنے سے نہ صرف حق ادا نہیں ہوسکتا بلکہ بہت سے اہل لوگوں کے کام کو خود کر لینے کی وجہ سے اُن سب کا حق بھی مارا جاتا ہے۔ مجھ سے بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اپنے لیے موضوعات طے کر لیں (اور پھر میرے لیے یہ موضوعات طے بھی کرا دیے)۔ باقی اہم چیزوں پر لوگوں کو نگاہ میں رکھیں کہ کس سے کیا لکھنے کو کہا جائے؛ کسی بھی دوسرے ڈومین میں خود ہرگز نہیں جانا۔

اُن کے حکم کے باوجود میں جن لوگوں پر ابھی تک نہیں لکھ سکا اُن میں ابو جان، محسن شاہ جی، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر عبدالجبار شاکر شامل ہیں۔ اِسی طرح ابھی تک ڈاکٹر ف عبدالرحیم کی کتاب ''Europe Speaks Arabic'' پر بھی لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔

☆

میرے ای میل باکس میں کتنی ہی میلیں ہیں جن میں اُن کے لیے یا پیر دستگیر، یا پیر و مرشد، ادرکنی یا آل محمد وغیرہ وغیرہ القابات لکھے ہیں۔ کبھی میں بہت موڈ میں ہوتا تو اُنھیں السلام علیکم کی بجائے السلام علیک یا آلِ محمد کہتا۔ یہ چند اشارے ہیں جن سے ہماری آپس کی باتوں کے تیور کا خوب اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆

میں جن لوگوں سے اُن کی معیت میں مختلف اوقات میں ملا اُن میں کے جن کے نام ابھی یاد میں آ رہے ہیں: مولانا تقی عثمانی، مولانا انظر شاہ صاحب (ابنِ مولانا انور شاہ کشمیریؒ)، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، ڈاکٹر مظہر معین، ڈاکٹر محمود الحسن عارف، ڈاکٹر عباس نجمی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر صاحب، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر عبدالجبار شاکر، جنابِ افتخار عارف، ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی، چودھری غلام یزدانی صاحب، سعود عثمانی، وغیرہ۔ یہ سب ملاقاتیں تفصیل سے ذکر کیے جانے کی محتاج ہیں۔ ہر جگہ، ہر موقع پر بڑی گہری باتیں ہوئیں۔ اِن میں سے ہر ملاقات ایک بے حد تفصیلی مضمون بنتی ہے۔ یہاں صرف یہی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



شیخ بزرگوں سے خود بھی ملتے اور مجھے بھی اللہ والوں سے ملنے کی طرف متوجہ کرتے۔ ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب سے میرا رابطہ ہوا تو خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ وہ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں۔ اب جب بات ہو تو میرا اسلامِ نیاز عرض کر دیں۔ پھر شیخ نے اُملج سے اُنھیں فون بھی کیا۔ کشفی صاحب نے ایک خط بھی اُن کے نام لکھا۔ شیخ نے اللہ کے کئی ایسے بندوں سے مجھے ملایا ہے جن سے تعلق کو میں نجات کے اسباب میں سے جانتا ہوں۔ ایسے لوگوں میں کے ایک مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی (نشتر میڈیکل کالج ملتان) ہیں۔ شیخ مجھے اُن کے پاس کئی بار لے کر گئے ہیں۔ زبان دانی، دین دانی، غیرتِ دینی، تقویٰ، عالمانہ فروتنی، تصنیف و تالیف، اللہ کے راستے کی نقل و حرکت اور عوام اور علما کے جوڑ کا ایک عجیب امتزاج اللہ پاک نے اُن کی ذات میں پرو دیا ہے۔

شیخ کے ایک عزیز دوست تھے حافظ اِرشاد صاحب۔ جوانا مرگ ہوئے۔ ایک دو پہر ہم دونوں اُن کے ہاں گئے۔ کھانا کھایا۔ پھر اُن کو ساتھ لے کر خالد مسعود خان صاحب کے یہاں حاضر ہوئے۔ مجھے خالد مسعود صاحب نے کہا کہ اپنے ابوجان کا کلام جلد چھاپ دیں۔ شیخ نے کہا کہ یہی کچھ آپ بھی اپنے کلام کے ساتھ کر ڈالیں۔ چند ہی دن بعد شیخ نے بتایا کہ حافظ ارشاد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُن کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اُن پر ''کتبہ'' کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی۔

☆

بھائی ذوالکفل جب پہلی بار میرے ہاں ہری پور تشریف لائے تو میرے ایک عزیز دوست مرحوم چودھری شبیر احمد صاحب بھی اُن کے لیے چشم براہ تھے۔ شیخ نے ہمارے ہاں دو دن گزارنا تھے۔ تشریف لائے تو آتے ہی فرمانے لگے کہ وقت کی تقسیم کر لی جائے کہ ہم لوگ کن کن موضوعات پر باتیں کریں گے۔ یہ میرے لیے نئی بات تھی۔

دو پہر تک شیخ نے ہم سے تصوف کے نام پر دیے جانے والے جھانسوں اور اہل اللہ کے واقعات میں ملنے والی Overstatements کی وجوہات پر باتیں کیں۔ چلتے چلتے یہ بھی بتایا کہ مرزائے قادیان ایسے ہی جھانسوؤں کا پیشوائے اعظم ہے۔ کھانے اور نماز کے بعد عصر تک تاریخِ اسلام کے ابتدائی مصنفین کے رجحانات کا جائزہ لیا۔ عصر سے مغرب تک انگریزی میں جملوں کی بنت (Sentence Structure) پر باتیں ہوئیں۔ مغرب کے بعد سے لے کر رات گئے تک آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آپس داریوں اور قربانیوں کا تذکرہ ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ رات کو جب سونے کے لیے لیٹے تو میں یہ سوچتا رہا کہ یقیناً حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اِسی طرح اوقات کی ترتیب ہوتی ہوگی: کبھی حسب و نسب پر بیان ہو رہا ہے تو کبھی اساطیر پر، اور کبھی اشعار سنائے جا رہے ہیں تو کبھی جنگی کارنامے۔ وغیرہ۔ ہم نے سارا دن شیخ کی باتیں سنیں لیکن کیا مجال ہے کہ ذرا بھی اُکتائے ہوں۔ مجھے حیات الصحابہ میں ملنے والے مختلف واقعات کی تعبیریں ملنے لگیں۔

☆......۴......☆

میری آٹوگراف البم پر شیخ کی خاص توجہ تھی۔ ایک بار مجھے ایک بہت خوبصورت قلم عنایت کیا اور فرمایا کہ کچھ آٹوگراف اِس سے بھی لوں۔ اُس سے پہلا آٹوگراف میں نے اُنھی کی معیت میں جنابِ مختار مسعود کا لیا۔ میں نے اپنی آٹوگراف البم میں ایک بار شیخ سے آٹوگراف بھی لے ہی لیا۔ آخری بار جب وہ ہری پور تشریف لائے تو میں نے درخواست کی کہ یا شیخ اب تو یہ ہو ہی جائے۔ اُن کا آٹوگراف میرا دیرینہ مطالبہ تھا۔ اُنھوں نے میرے ابوجان کے مندرجہ ذیل دو نعتیہ شعر لکھ دیے: ؎

تہذیب کے فریب کا انسان تھا شکار
ریگِ عرب نے کھولی حقیقت سراب کی
عابد خوشا دُرود کی کثرت، زہے شرف
تفریق اُٹھ گئی ہے حضور و غیاب کی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ابو جان کو میں اُتنا نہیں جانتا تھا جتنا کہ شیخ کی وجہ سے جانا۔ فرماتے تھے کہ دو تین لوگ ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے: عابد صاحب، تاثیر وجدان صاحب، اسلم انصاری صاحب۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اِنھیں خاص طور سے یونیورسٹیوں سے دور رکھا گیا ہے، کہ اِن کی وجہ سے بہت سوں کی علمیت کے پول کھل جاتے۔ ایک بار فرمایا عابد صاحب کا فقر جبری نہیں، اختیاری تھا۔ اور اُنھوں نے بہت کچھ سوچ کر اِسے اختیار کیا تھا۔ اُن کو دفالیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں کہ وہ اِستغنا کی اِتنی اونچی سطح پر تھے کہ کم سے کم اُن کے ماحول کے لوگوں میں سے کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچا۔ پھر اُن کا یہ شعر سنایا:

اَنہد مُرلی کے سُر ڈاریں جان میں سو سو چھید
خالی کان چھدا لینے سے بنتا نہیں ملنگ

ابو جان کے بارے میں کئی باتیں مجھے شیخ سے پتہ چلیں۔ مجھے کہا کرتے تھے کہ اُنھوں نے آپ بچوں پر بڑی محنت کی ہے اور آپ کے لیے بڑی مشقت جھیلی ہے۔ بہت تنگی کا وقت کاٹا ہے۔ ایک بار بتایا کہ ایک دفعہ وہ تشریف لائے تو محسن ماموں نے کہا کہ یار عابد، بڑی دیر بعد چکر لگایا۔ جواب میں عابد صاحب نے کہا کہ لالہ جی، ایک تو مصروفیت رہی۔ اور دوسری، سچی بات یہ ہے کہ اتنی گنجائش بھی نہیں تھی کہ چکر لگا سکوں۔ کرائے کے پیسے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں نے شان الحق حقی صاحب پر مضمون لکھا۔ میں نے شیخ کو بتایا کہ یہ اور یہ جملہ جو میں نے اِس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے، تحسینیات میں ابو جان کے فلاں مضمون سے نقل ماری ہے۔ اور یہ پڑھنے کی توفیق بھی مجھے صرف تحسینیات کی پروف ریڈنگ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اگر اپنے ابو کے مضمون بار بار پڑھنے کے بعد اتنی بھی اردو نہ آتی تو آپ اُن کے بیٹے ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر کہا کہ وہ ایسے استاد تھے کہ اُن کی کلاس میں بیٹھنے والا جاہل رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

میرے ابو جان سے شیخ کو خاص تعلق تھا۔ مجھے قطعی الفاظ میں یہ کہا تھا کہ میں انگریزی میں تو پی ایچ ڈی نہیں کر سکوں گا کیوں کہ عمر بڑھ گئی ہے اور مصروفیات کا ہجوم بھی ہے، لیکن اردو میں ضرور کروں گا اور عابد صاحب پر کروں گا۔ یہ شاید ۲۰۰۰ء کے آس پاس کی بات ہے کیوں کہ اُن کا TEFL مکمل ہوئے کچھ زمانہ ہو چکا تھا۔ پھر جب شیخ سعودیہ چلے گئے تو ایک بار واپس ہوئے تو فرمایا کہ شاید میں پی ایچ ڈی نہیں کر سکوں گا کیوں کہ ایک منحوس نے مجھے کہا ہے کہ تم یہ نہیں کر سکو گے۔ اور اُس کی کالی زبان سے نکلی بات پوری ہوا کرتی ہے۔

☆......۵......☆

شیخ نے اور میں نے مل کر دو لغات بھی مرتّب کیے ہیں۔ پہلے یعنی اردو-انگریزی لغت کا تسویدی ایڈیشن چھپ بھی چکا ہے۔ اردو-اردو لغت پر الحمدللہ بہت سا کام ہو چکا ہے۔ اِس لغت میں ہم نے کوئی پونے دو کروڑ الفاظ کے ڈیٹا پر کام کر کے اردو کے کثیر الاستعمال نیز اہم الفاظ کو خصوصیت سے جگہ دی ہے۔ الفاظ کی سمائی کے اعتبار سے ہمارے یہ لغات قریب قریب Advanced Learner's اور Dictionary of Language & Culture کے نمونوں پر تیار کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں لغات اردو زبان (Language) کے لغات ہیں۔ اب سے پہلے کے لغات زیادہ تر صرف ادب (Literature) کے گرد گھومتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اردو کی جہد للبقا کے ضمن میں ادب کو زبان سے الگ کیا جانا ہماری دانست میں ضروری ہے۔ لیکن اِس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ ادب کو بالکل ہی نکال باہر کیا گیا ہے۔ بہت احتیاط کے ساتھ کوشش کی گئی ہے کہ یہ لغت ادب کے لیے بھی کارآمد (Companion to literature) رہے۔ زبانِ اردو کے وقیع کام کرنے والوں کے ضمن میں ہم نے یہ طے کیا تھا کہ شاعروں میں غالب کے بعد اقبال، فیض، اکبر، مجید امجد، حفیظ، شورش، ظفر علی خاں، عدم، اختر الایمان اور جگن ناتھ آزاد کی شاعری کی لفظیات کو اردو کارپس (Corpus) کا حصہ بنایا جائے اور ناثروں میں فرحت اللہ بیگ، بابائے اردو مولوی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، پطرس، منٹو، ابنِ انشا، مختار مسعود، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی۔ معاصر ادب اور میڈیا، مختلف رسائل و جرائد، کالم، وغیرہ۔

☆......۶......☆

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم سارا دن اور رات گئے تک ملتان کی سڑکیں ناپا کرتے تھے۔ کبھی خالد صاحب بھی اپنی موٹر سائیکل پر ساتھ ہوتے۔ پٹرول آٹھ روپے پچھتر پیسے لٹر تھا۔ ہم خوب پٹرول پھونکتے۔ پھر پھرا کر رات کہیں واپس آتے تو عشا کی نماز اکٹھے پڑھتے۔ شدید گرمیوں میں ایک بار کہیں رات پونے تین بجے واپس ہوئے۔ تھکن سے چور تھے۔ بیٹھک میں تخت پر بیٹھ کر چٹاخ پٹاخ کھانا کھایا اور بھاگم بھاگ نماز پڑھی۔ یہ نماز بھی یادگار ہے۔ اِس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر آتا ہے، اِس طرح کہ ہم نے ایک رکعت والے وتر پڑھے۔ فجر کی اذان میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ فرمایا کہ کان لگالو۔ جہاں کوئی مؤذن غلطی سے بھی اذان شروع کردے، ہم اپنی فجر پڑھ کر سولیں گے۔ خدا خدا کر کے کہیں سے اذان کان میں پڑی۔ ہم نے سنتیں پڑھیں۔ نماز کی ''قیادت'' حسبِ معمول اِس خاکسار نے کی۔ اِس بیٹھک اور تخت سے کئی یادیں وابستہ ہیں۔

بیٹھک میں سونا ہوتا تو نمازِ فجر کے بعد ہم دونوں دودھ لینے کے لیے جاتے۔ اِس آن جان میں شیخ نے تاریخِ اسلام کی بہت سی جہات پر گفتگو کے علاوہ اپنے خاندان اور بزرگوں سے متعلق بے شمار باتیں اور علی الخصوص مجلسِ احرارِ اسلام کی جدوجہد کے بارے میں بتایا۔ یہ میرے لیے بہت قیمتی ذہنی غذا تھی جس کا کہیں اور سے ملنا شاید کبھی ممکن نہ ہوتا۔ میرے لیے بہت سی باتیں بالکل نئی ہوتی تھیں کیوں کہ ہم نے جو تاریخِ پاکستان پڑھی تھی وہ مطالعۂ پاکستان کا مسلم لیگ بلکہ حکومتِ پاکستان ورژن تھا (جو ہر آنے والی حکومت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ قیامِ پاکستان کا مقصد اور قائدِ اعظم کا مقصودِ نظر (vision) تک بھی ہر حکومت کی تفسیر بالرائے کے تابع ہوتا ہے اور ہر حکومت اِس کا نیا ایڈیشن متعارف کراتی ہے)۔ اللہ میرے شیخ کی قبر کو نور سے بھر دے، وہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اکابر کے بارے میں اِس ناہنجار کی گستاخانہ شُر لیوں کا نہایت یکسومزاجی سے جواب دیتے۔

گلی گلی ملتان کی جہاں ہم پھرا کرتے تھے، اب کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔

☆......۷......☆

زندگی کے بے اعتبارا ہونے کا تو سنتے آئے ہیں۔ دیکھا بھی ہے۔ لیکن وقت کے اِتنی سرعت کے ساتھ گزرنے کا علم ابھی ہوا ہے۔ ابھی کل کی، بالکل کل کی بات ہے کہ شیخ کی شادی ہوئی تھی اپنے ماموں حضرت پیر جی عطاء المہیمن بخاری کی بیٹی سے۔ شیخ شادی سے محض دو دن پہلے سعودیہ سے تشریف لائے تھے۔ ہم اسلام آباد سے صبح نماز کے بعد پہنچے۔ اگلے روز بعد نمازِ عصر نکاح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نکاح کے موقع پر دعا کے وقت میں شیخ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جسے دیکھ کر میرے پسینے نکل گئے تھے اُس سخت سردی میں۔ لوگ کھڑے ہوئے اور مبارک سلامت کا شور اُٹھا۔ صبح شیخ کے ولیمے میں دارِ بنی ہاشم کے احاطے میں سارا ہی شہر اکٹھا تھا۔ یہ یادیں اور یہ مناظر بسرائے نہیں بسرتے۔

۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء کی صبح بھی دارِ بنی ہاشم کے اِسی احاطے میں سارا ہی شہر اکٹھا تھا۔ اب کے بھی لوگ میرے شیخ سید ذوالکفل کے حوالے سے اکٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ اجتماع ہِک ہِک کر روتے تعزیت کرنے والوں کا تھا۔ میں اِس روز اِن لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ میں اِس مجمع میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں شیخ کو رفتگان میں شمار نہیں کرسکتا تھا۔

☆......۸......☆

میں بہت کمزور دل آدمی ہوں۔ موت برحق ہے، اور یہ اللہ سے ملاقات ہے، جس کا شوق ایمان کی علامت ہے۔ لیکن میں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کچھ لوگوں کو فوت ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ مثلاً مشفق خواجہ صاحب۔ میں محسن شاہ جی کی وفات پر بھی ملتان نہیں آیا۔ حالانکہ آ سکتا تھا۔ میں کیسے دیکھ لیتا اُن کو۔ اب بھی، اللہ نے مجھ سمیت سب پر رحم کیا کہ میرے شیخ کو اپنے پاس بلا کر وہیں رکھ لیا۔ اگر وہ یہاں آ کر فوت ہوتے تو مجھ سمیت بہت سے لوگ یہ صدمہ جھیل نہ سکتے۔ یہ بات جذبات میں نہیں، ہوش میں لکھی گئی ہے۔

میرے شیخ نے ایک مثالی شوہر والی زندگی گزاری۔ یہ بات محض لفاظی نہیں ہے۔ اللہ نے بیوی اور بچوں کی صورت میں اُنھیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّۃَ اَعْیُنٍ) عطا کی تھی۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایسا نصیبا محض یک رُخا نہیں ہوتا۔ حضرت پیر جی مدّظلہ اپنی اہلیہ کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ میری ملنگنی نے تو مجھ سے کبھی یہ تک نہیں کہا کہ گھر میں چینی ختم ہوگئی ہے۔ اُس نے پوری زندگی مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ جب وہ یہ کہتے ہیں تو ہم دنیادار لوگ اُن کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ ایسی ماں کی تربیت یافتہ بیٹی جہاں رہے گی، گھر جنت ہی کا نمونہ ہوگا۔

وہ ایک فرمانبردار بیٹے، ایک مخلص اور کام آنے والے دوست، محبت کرنے والے انسان، اللہ کے ایک عاجز بندے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے امتی تھے جنھیں اِن شاء اللہ اُن کا پڑوس نصیب ہوگا۔ بلکہ اُنھیں تو گھر والوں کا قرب نصیب ہوگا کہ وہ تو گھر کے آدمی بنتے ہیں۔ اماں جان کے قدموں میں جا لیٹے۔ اماں جان کے ساتھ ہی اللہ کے پاس جائیں گے۔ کیا معلوم اماں جان ساتھ ہی لے جائیں۔ بندہ اللہ سے مانگتا ہے کہ یہ دے اور یہ دے۔ پھر جب سب کچھ مانگ چکتا ہے تو کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے تو وہ مانگا جو میں تیری توفیق سے مانگ سکتا تھا، تو مجھے اپنی شان کے مطابق عطا فرما دے۔ میرے شیخ یقیناً یہ مانگتے تھے۔ اللہ نے اُن کو اپنی شان کے مطابق عطا کر دیا۔

میرے شیخ کو اللہ نے چار بار حجِ بیت اللہ کی سعادت نصیب فرمائی۔ وہ اِس سال بھی حج کی نیت کیے ہوئے تھے۔ گو خود حج نہ کر سکے، لیکن اُن کے لیے ایک فرشتے نے حج کیا۔ اور جب تک حج ہوتا رہے گا، ہر سال ایک فرشتہ اُن کے لیے حج کیا کرے گا۔ یہ ایک حدیثِ پاک کا مضمون ہے۔

☆

شیخ کے والد چچا جی سید وکیل شاہ صاحب تو کہتے ہیں کہ اے اللہ میں تیری رضا پر راضی ہوں۔ منّا مجھے تو نے ہی دیا تھا، تو نے ہی واپس بھی لے لیا۔ آنکھوں کے تارے، جواں سال بیٹے کے صدمے کو یوں جھیلا کہ کسی کے سامنے آنکھوں سے آنسو ڈھلکانا تو ایک رہی، تعزیت کرنے والوں کو خود دِلاسے دیتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت حضرت پیر جی کی ہے۔ بلکہ وہ تو گفتگو میں باقاعدہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

کفیل بھائی جان کی ڈاڑھی کے بالوں میں سفیدی تو پہلے بھی تھی، پچھلے دو ڈھائی مہینے میں یہ بالکل ہی سفید ہوگئی ہے۔ وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اُن کے غم کو کوئی کیا بٹائے گا۔ اور کوئی کیا سہارا دے گا اُنھیں۔ بھائی جان جذبات کے اظہار میں بھی احراری ہیں۔ عیدالاضحیٰ کی شام میں نے اُنھیں فون کیا۔ فرمایا کہ بجھے ہوئے کیوں ہیں۔ ہم نے تو عید بھی پڑھائی ہے۔ عید کی خوشیوں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ صفوان بھائی یہ سنت ہے سنت۔ اُنھوں نے شیخ کی آخری دنوں کی بڑھتی للہیت اور تضرع کے بارے میں مجھ سے وہ کچھ کہہ دیا جسے میں نہیں کہہ سکا تھا۔ نظر کا لگنا حق ہے کیوں کہ نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے توڑ کے اعمال بھی تعلیم فرمائے ہیں۔

اُن کا بھائی چلا گیا ہے، اور میرا شیخ۔ نہ اُن کا بھائی محض برادرِ خورد تھا، اور نہ میرا شیخ شیخِ محض۔ ہم دونوں کو ہی شاہ مات ہوگئی ہے۔



© rasailojaraid.com